ڈاکٹر نسرین اختر

اصنافِ سخن اور مومنؔ

— ۲ —

غزل

مومن کی تخلیقاتِ شعری کا ایک بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے اور غزل ہی اُن کا سرمایہ کما
مومن ہمیشہ عام روش سے الگ رہتے تھے۔ ان کی مشکل پسند اور جدت طراز طبیعت
کرنا عار سمجھتی تھی، اس لیے انھوں نے شاعری میں نئی طرز ایجاد کی، جو معاملہ بند
مضمون آفرینی میں غالب کی طرز سے نازک تر ہے۔

مومن کے ہم عصر غالب میں بیدل کا رنگ پایا جاتا ہے، لیکن مومن نے کسی کا
اختیار نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی ذاتی طرز خود ایجاد کی۔ ابتدا میں انھوں نے
غزلیں شاہ نصیر اور بیدل کے رنگ میں کہیں، مگر اس انداز کو ترک کر
ان کی غزلیات خاص طرز کی حامل ہیں، ان کی خصوصیات حسبِ
ہیں:

تغزل: فارسی شعرائے متاخرین کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ فلسفۂ اخلاق اور
سبھی کچھ نظر آتا ہے لیکن مومن کا یہ وصف ہے کہ انھوں نے غزل کو حقیقی مفہو
منحصر کر دیا اور ان کی تمام تر شاعری داخلی ہے۔ اس ضمن میں ضیا احمد صاحب لکھتے

"غزل میں نازک خیالی، معاملہ بندی اور سوز و گداز میں مومن اپنے تمام معاصر
فائق ہیں[۱]۔"

اسی طرح پروفیسر وقار عظیم اپنے مقالہ میں بیان کرتے ہیں:

---

[۱] دیباچہ دیوان مومن، ص: ۷۳

"مومن تنہا غزل گو شاعر ہیں، جن کے رنگ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے۔ میرے ذہن میں تغزل کا وہی مفہوم ہے جو عاشق، محبوب اور رقیب کی مثلث میں گھرا ہوا ہے۔ غزل لوازمیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن میں اسے تغزل نہیں کہتا۔ تغزل کی کمی غالب کے کلام میں بھی نہیں لیکن غالب اپنی شاعرانہ پیغمبری کے باوجود تغزل کو اکثر رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نہ نکال سکے، اور یہ کام سب سے پہلے مومن نے کیا، اور اس طرح کیا کہ اُن کا رنگ خاص بن گیا۔ اس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ مومن کی غزلوں میں عشق کی داستان، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ساقی و بادہ کی زبان سے بیان نہیں کی گئی، کیونکہ ان کی ندرت پسند طبع کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنے عشق کی کہانی ان پیاموں کی زبانی دوسروں تک پہنچائیں۔ اس لیے چند گنے چنے اشعار کو چھوڑ کر مومن کی غزلیں ان روایتی اشاروں سے بالکل پاک ہیں۔"[۲]

پھر اپنے ایک اور مقالہ میں سید وقار عظیم مومن کی نسبت رقم طراز ہیں :

"مومن کے تغزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغزل کو روایت کا ایک عنصر اور جزو سمجھ کر کبھی رسمی انداز سے نہیں برتتے۔ انھوں نے ایک عورت کو اپنا محبوب بنایا ہے اور محبت کے اس رشتہ کی مختلف کڑیوں سے اپنے اندازِ تغزل کو حسن و دلفریبی دی ہے، جس طرح اُن کے عشق میں خلوص اور ان کے محبوب کی دلبری اور دل ستانی کی ساری صفات کے باوجود ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور روک تھام ہے، یہی خلوص، رکھ رکھاؤ اور روک تھام اکثر جگہ اُن کے رنگِ تغزل میں نمایاں ہے۔ مومن کے تغزل میں صحت مندی کا جو گہرا پرتو ہے وہ نہ صرف اسے عشق و عاشقی کی دنیا میں عالی مرتبہ بناتا ہے، بلکہ شاعری کے نکتہ نظر سے بھی اس میں ایک ایسی کشش پیدا کرتا ہے جو مومن سے پہلے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ مومن کا یہی مخلصانہ انداز اور محبوب کا یہی غیر رسمی، لیکن دلآویز تصور ہے جس نے مومن سے تغزل کے بہترین شعر کہلوائے ہیں۔"[۳]

---

[۲] مجلہ نگار، ماہ جون ۱۹۵۳ء، ص : ۴۶

[۳] ایضاً، جنوری، فروری ۱۹۵۳ء ص :

ایسے ہی مومن کے تغزل کے بارے میں عرش گیاوی کا بیان ہے:

"تغزل کا اُن کے ہاں انداز یہ ہے کہ اشعار کے مضامین پیچیدہ، نازک خیالیوں اور ترکیبوں کے ساتھ درد و غم سے معمور ہیں۔ ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنی عجیب اور دلکش پیدا کر دیتے ہیں"[۵۴]

مضمون آفرینی

متاخرین شعرائے فارسی کی شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ ذراسی بنیاد پر تخیل کی سربلند عمارت قائم کر دیتے ہیں۔ فغانی اس طرزِ تازہ گوئی کا بانی خیال کیا جاتا ہے جس کے مقلد ایران میں محتشم کاشی اور شفائی تھے اور ہندوستان میں عرفی اور نظیری تھے۔ اس رنگ کو ظہوری، جلال، طالب اور کلیم نے ترقی دی اور ناصر علی سرہندی اور بیدل نے انتہا تک پہنچا دیا۔ ان لوگوں کے کلام میں عموماً اغلاق اور دقت پائی جاتی ہے جس کی وجہ مبالغے کا دور از کار ہونا، یا ابہام و رعایت پر شعر کا مبنی ہونا، یا کسی بڑے طویل خیال کو مختصر عبارت میں ادا کرنا ہے۔

مومن کا بھی بطور فارسی شاعر اس رنگ سے آشنا ہونا ناگزیر تھا، فارسی غزلیات میں مضمون آفرینی، مشکل پسندی، مبالغہ اور ابہام و پیچیدگیٔ مضمون بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل چند اشعار سے واضح ہے:

رشک رنجیست کہ سہل آید و مشکل برود

کاش از یاد روی تا گلہ از دل برود

پھر مبالغہ جو کہ سبکِ ہندی کی نمایاں خصوصیت ہے، مومن کے ہاں بدرجہ غایت موجود ہے، مثلاً:

یوسفستانِ سخن طلعت جانانۂ ما　　خواب از چشم زلیخا برد افسانۂ ما

اسی طرح مومن، مبہم، مشکل اور پیچیدہ مضامین جو کہ فہم عمومی سے بالاتر ہیں، یوں بیان کرتے ہیں:

---

۵۴ حیاتِ مومن، عرش گیاوی، ص: ۱۱۰، ۱۱۱

رحمی چہ سکنی بگمان جنون شوق   پیراہن رقیب قبا کردہ ایم ما

اور اس شعر میں:

سوزن فگندہ بہر چہ از آسمان مسیح   فکر رفوی چاک گریبان کس مباد

اس کے علاوہ مومن مطول تراکیب کا استعمال بھی کرتے ہیں جو موسیقی کے اعتبار سے تو خوب ہیں مگر مضمون کے لحاظ سے خوش آیند نہیں۔ ان اشعار میں تکلّف اور تصنّع بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ سبک ہندی کے یہ شعرا مشکل ردیف قائم کر کے شعر کہنا فخر سمجھتے تھے، حالانکہ یہ مشکل پسندی اصولاً شعر کو کمزور اور ضعیف کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر چند غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں:

پژمردہ گل بفرش تو دیدم دریں چہ بحث

بوئے گل از رقیب شنیدم دریں چہ بحث

با یاس وصل پرسش پنہاں چہ احتیاج

مردیم و مردہ راست بدرمان چہ احتیاج

گناہ از دست ولی چون شود زبان گستاخ

کہ یار بر سر خشم است و دشمنان گستاخ

افزون تر است از تو مرا شیوہ ہا لذیذ

جور و جفا کہ گفت چو مہر و وفا لذیذ

کیفیت غم سبک ہندی کے شعرا بشمول مومن کے ہاں عموماً مشاہدہ میں آتی ہے۔ مثلاً شاعر اپنے معشوق جفاجو اور ستم پیشہ کے ہاتھوں مقتول ہوتے یا زخم کھانے کی شدید آرزو کرتا ہے:

شمشیر در کف آن ستم آئین نمی رسد

مردن بداد عاشق غمگین نمی رسد

ایک اور جگہ اسی خیال کو یوں پیش کیا ہے:

مژدۂ قتل من از لب دشمن برسال

قاصد از کوئے تو نخواہم بدل شاد رسد

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں غم و آلام سے رہائی پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، مگر نتیجہ برعکس ہوتا ہے۔ زندگی کی اس حقیقت کو مومن نے کس عمدہ انداز میں پیش کیا ہے:

داد از دست طپید نہای من
تنگ تر بر خویش کردم دام را

پھر مومن کا یہ شعر ایک حساس اور غم دیدہ دل کی صدا معلوم ہوتا ہے اور اپنی سادگیِ مضمون کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے:

نفسی نیست کہ از دستِ تو آزارم نیست
بروای دل کہ بتو ہیچ سروکارم نیست

یاس، حزن اور غم کی گوناگوں تصاویر جو ہمیں اس دور کے اکثر شعرا اور مومن کے کلام میں عموماً دکھائی دیتی ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ ان کے زمانے کی خارجی حالت تھی جو سیاسی، اقتصادی اور فکری اعتبار سے مشوش ہو رہی تھی۔ مغلیہ دور کی عظمت ختم ہو چکی تھی۔ اس زمانے کا عظیم الشان شاعر غالب بھی اپنی زمانے کی اس خارجی حالت سے بے حد متاثر دکھائی دیتا ہے، اور اکثر جگہ وہ بھی اپنے معاصرین کی طرح موت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ اس اندوہ و غم کی ایک مجسم تصویر خود مغلیہ دور کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھا، جس کا کلام اس کے درد و کرب کی پوری پوری آئینہ داری کرتا ہے۔ مومن کے اکثر اشعار اسی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مومن کی شاعری میں ہندی ماحول کا اثر بھی نمایاں ہے۔ اگرچہ یہ شعرا بالعموم مسلمان تھے اور اسلامی اقدار کی نگہبانی میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، لیکن ہندوستان کے مذاہب کا اثر ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ مومن کے ہاں اس اثر کے تحت ہندی مذہب اور ثقافت کے الفاظ بکثرت اور مکرر ملتے ہیں، جن کو وہ شعوری طور پر تو استعمال نہیں کرتا، لیکن غیر شعوری طور پر یہ الفاظ اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً صنم، صنم کدہ، زنار، کفر، بت پرستی اور دیر نشینی وغیرہ۔

کبھی کبھی مومن اپنے آپ کو اسی لاشعوری کے تحت دائرۂ اسلام سے نکال کر بُت پرست
ن جاتا ہے اور یوں کہتا ہے:

مومن ز باز پرس قیامت مرا چہ بیم
با بُت پرست کار ندارد خدائی تو

مومن بعشق بُتی کاتش رخسار او
دفتر عصیان ما روز جزا سوختہ

موسیقی

سوز اگر ساز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔ مومن کی فارسی
غزلیات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر شعر میں زیادہ سے
زیادہ ترنم اور نغمہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی بعض غزلیات میں متناسب اور
ہم آہنگ الفاظ کے استعمال سے موسیقی کا عنصر پیدا ہو گیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
طاؤس و رباب کے نغمے ہیں جو مصرعوں میں ڈھل گئے ہیں۔ مثلاً یہ غزل موسیقی کے قالب میں
ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

وعدہ او دہد کجا صبر و سکون بجان ما
یار چو زندگی وفا گر کند اعتبار کو

غمزۂ او دلِ تپاں خوردہ لبسینہ داد جان
ای مژۂ جگر فشاں گریۂ زار زار کو

شام غمم شود سحر درد دلم کند اثر
یار بمن رسد مگر طاقت انتظار کو

غزل میں تسلسل

غزل دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے، چنانچہ غزل میں مختلف قسم کے جذبات نہیں کہے
جا سکتے۔ لیکن عاشق کی باتیں کبھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور کبھی اُن میں تسلسل
پایا جاتا ہے، اس لیے غزلوں کے اشعار مختلف بھی ہوتے ہیں اور متواتر بھی۔ مومن کے دیوان

میں بھی بعض غزلیں مسلسل ملتی ہیں۔ کبھی کسی ایک کیفیت میں اتنی شدت اور رہمہ گیری ہوتی ہے کہ اس کے اثر سے پوری غزل لکھ جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک خاص جذبہ مختصر سی زندگی لے کر نمودار ہوتا ہے اور آن کی آن میں ختم ہوجاتا ہے اور اس جذبے کے اظہار کے لیے ایک شعر کافی ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات جذبہ دریا کی موج کی طرح بیکراں ہوتا ہے۔ بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کافی عرصے تک بقا کو قائم رکھتا ہے۔ اس قسم کے جذبے کو بیان کرنے کے لیے ایک شعر کافی نہیں ہوتا، ضرورت پڑتی ہے کہ اسے ایک سے زیادہ اشعار میں بیان کیا جائے۔ مومن نے بھی اسی قسم کا اظہار کرنے کے لیے اکثر غزلیات میں تسلسل قائم کیا ہے۔ مثلاً :

کیستم؟ بے قرار و غم زدۂ — دو جہان را بہ روی ہم زدۂ
عاشقی سخت آرزومندی — بے دلی بے کسی ستم زدۂ
پاک بازی و دامن آلودہ — غوطہ در خونِ چشمِ نم زدۂ
در خیالِ بُتِ کمان آبرو — شیر بر آہوئے حرم زدۂ
بستہ عہدِ وفا و بہ بیتابی — بسرِ عاشقی قسم زدۂ
در محبت فزودہ رنگینی — داستانی بخونِ رقم زدۂ
منکرِ شیخ شہر مومن نام — بوسہ بر پائے ہر صنم زدۂ

تراکیبِ جدیدہ

مومن کے ہاں غزلیات میں تراکیب کی فراوانی ہے اور بہت سی تراکیب مومن نے خود ضرورتِ شعری کے لیے ایجاد کی ہیں مثلاً :

خضرِ توفیق، سرگرمِ شکوہ، حرفِ شوق، حسرت زدہ، حسرت جاودانہ، دردِ نامرادی، دیدۂ چرخ، تیغِ رشک، گرمیٔ گفتار، نشۂ طامات، غمِ بوسہ، شوخِ ستیزہ، قہرِ حسن، پست و بلندِ زمانہ، بامِ شوق، سرشارِ عشق، بازارِ خود فروشاں، جامِ ناز، برگِ شکایت، وغیرہ کی تراکیب مومن نے خود ایجاد کی ہیں۔ ان عمدہ تراکیب کے علاوہ مومن کے کلام میں چند مبہم اور پیچیدہ تراکیب بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً :

[illegible]

غیرہ مومن کے کلام میں مشکل پسندی اور دقت کا عنصر پیدا کرتی ہیں۔

معاملہ بندی

عشق کی ہوسناکی میں جو معاملات پیش آتے ہیں اُن کے بیان کو بقول شبلی اہلِ سخن معاملہ بندی کہتے ہیں۔ بابا فغانی اور نظیری وغیرہ نے معاملہ بندی کے جوہر دکھائے ہیں اور وقوعہ گوئی کے موجد مانے جاتے ہیں۔ اسی طرح مومن نے بھی دہلی کی متانت کو نبھاتے ہوئے دائرۂ تہذیب میں رہ کر جذباتِ عشق کو ادا کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

نازم بہ بے وفائی و بیدردیت کہ من
حال تباہ دارم و گوئی تباہ نیست

روزِ جزا ز قتلِ من انکار میکند
گویا کہ طرزِ خندۂ او ہم گواہ نیست

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وفای زیست بمن ہم روا نمیداری
ز مرگِ غیر بعہدِ وفا چہ سوگند است

تلمیحات

صنائعِ شاعری میں ایک چیز تلمیح ہے یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا، مومن کے کلام میں اکثر تلمیحات نظر آتی ہیں، مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

گداخت تا دل روحانیاں بہ نیم نگاہ
ز سحر چشم تو شوری ببابل افتاد است

مومن نے بعض غزلیں بڑی فصیح اور واضح بھی کہی ہیں۔ مثلاً اس غزل میں جذبۂ شوق اور شدتِ آرزو بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ بعض اشعار اس حد تک روشن اور دلنشین ہیں کہ مومن کو ہم شعرائے معاصرین کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں۔ مثلاً اس کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

جانم بلب رسید کجائی بیا بیا — وقت است گریہ پرسشم آئی بیا بیا
دیگر من و ستائش ہم بزمی رقیب — باز آمدم ز شکوہ سرائی بیا بیا
لیلی بدشت رفتہ و شیریں بہ بے ستون — پابند اعتنا طِ جدائی بیا بیا
در اشتیاق دیدہ برخسارم سودنم — از دور جلوہ ہا چہ نمائی بیا بیا

اکنوں ستیزہ چیست کہ اندا ختم سپر
دانم ز جور باز نیائی بیا بیا

عمدہ غزلیات میں سے یہ اشعار مرکبات و مفردات کے حسن کے اعتبار سے نہایت دلکش اور قابل قدر ہیں:

چہ نالہ ہائے فلک سوز کردہ ام امشب
بیاد مہر رخت روز کردہ ام امشب
ہجوم رنج پریشان شد از امیدِ وصال
ستم بجان غم اندوز کردہ ام امشب

بعض اشعار معانی کے اعتبار سے نہایت خوب صورت اور قوی ہیں۔ مثلاً شاعر کہتا ہے کہ کسی نہ کسی صورت خدا کے حضور میں نیاز پیدا کرنا چاہیے، خواہ بت پرستی ہی کیوں نہ کرے:

بت پرستی کن و آموزش یزداں دریاب
گر سر کفر نداری غم ایماں دریاب

اس کے علاوہ بھی چند ایک لطیف و دل نشین غزلیات مومن کے کلام میں موجود ہیں۔